ماہ رُخ
پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد
ڈاکٹر ممتاز خان کلیانی
پروفیسر، شعبہ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

مارکسی تنقید اور علی احمد فاطمی

Abstract:

Marxist criticism presents the analysis of literature from the angle of class relations and social conflicts. Most of the times the interpretation made in the light of Marxist theory is materialistic and addresses the historical development of human struggle. Therefore, Marxist Urdu critics and creative writers have focused on the relationship of life and literature. They are of the opinion that literature is all about the representation of life from every aspect. Progressive Writers Movement (PWA) of Urdu was based upon Marxist theory. This article introduces Ali Ahmad Fatmi, a renowned figure of PWA and prominent Marxist critic of Urdu, and his works.

Keywords:

Fatmi Marx Karl Marxism Theory Progressive Urdu

تنقید کے دوسرے دبستانوں کی نسبت مارکسی تنقید کا اختصاص یہ ہے کہ یہ ادب پارے کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھتی ہے اور اس بات میں کسی حد تک صداقت ہے کہ اس تنقیدی فکر کا آغاز بھی خالص ادبی مقاصد کے لیے نہیں بلکہ سماجی نوعیت کا تھا۔ کیوں کہ اس کی بنیاد میں اشتراکیت کی صورت میں ایک نظریہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اس دبستانِ تنقید نے پہلی مرتبہ اپنے ڈسکورس میں سماج اور اس سے وابستہ عوامل کی ان کارفرمائیوں کو خاص اہمیت دی ہے جو کسی طور بھی ادب اور ادیب پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ چونکہ مارکسی تنقید ادبی تنقید کا جدید ترین اسکول ہے اس لیے یہ موجودہ دور کے تمام نفسیاتی، جمالیاتی، عمرانی اور فنی علوم کو ارتقائی نقطہ نظر سے اپنانے کی دعویدار ہے۔ یہ ادب پاروں کے داخلی اور خارجی دونوں عناصر کا تجزیہ کرتے ہوئے معاشرہ کی تبدیلیوں اور انقلابوں کا ادب کے موضوعات پر اطلاق کرتی

ہے۔مزید براں یہ کہ اس کے ذریعے تمام صحت منداور جدید نفسیاتی تجزیوں کا ادب میں احترام دکھائی دیتا ہے۔ یہ فارم اور ہیئت کے معاملہ میں ایسے تناسب اور جمال کی قائل ہے جو گردو پیش کی موضوع حقیقتوں سے تخلیقی طور پر پیدا کیے گئے ہوں، یہ اظہار وابلاغ ان کے تمام جدید ترین تشریحوں کو اپناتی ہے جو انسان اور تاریخ کو آگے بڑھانے میں ممد ثابت ہو سکیں (۱)۔

مارکسی نقادوں نے ادبی مسائل، تنقیدی معیارات اور فنی ضوابط کے مباحث میں تنقیدی بصیرت سے کام لیتے ہوئے اردو تنقید کو نہ صرف شخصیت پرستی اور لفظی بحث سے آزاد کرایا بلکہ اُسے سائنسی مزاج کا حامل بھی بنا دیا۔ڈاکٹر شارب ردولوی کے مطابق:

''مارکسی تنقید کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر اُس نے یہ تسلیم کیا کہ فن کار اپنے طبقے اور زمانے کا عکاس ہوتا ہے۔''(۲)

اردو تنقید کے فروغ میں مارکسی نقادوں کی بھرپور خدمات ہیں۔ان ناقدین نے ادب اور سماج کے باہمی رشتوں کے انسلاک سے قاری کے لیے تنقید کی نئی راہیں کھولیں۔اس ضمن میں اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، سجاد ظہیر، عزیز احمد، ڈاکٹر عبدالعلیم، احمد علی، احتشام حسین، ممتاز حسین، ڈاکٹر عبادت بریلوی، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، اختر انصاری، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، ڈاکٹر محمد حسن، قمر رئیس، محمد علی صدیقی، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر شارب ردولوی، اصغر علی انجینئر، عتیق احمد، ڈاکٹر اے بی اشرف اور شہزاد منظر وہ نام ہیں جنھوں نے اردو مارکسی تنقید میں فکری تنوع اور سوشلسٹ تصورادب کی تشریح کی معتبر مثالیں پیش کیں۔

مارکسی تنقید میں احتشام حسین کا شمار اُن ناقدین میں ہوتا ہے جو کسی فن پارے کو پرکھنے کے لیے ادبی اور جمالیاتی قدروں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے بلکہ یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس سے اشتراکیت کو کتنا فائدہ پہنچا، اور محنت کشوں کی حمایت میں جو جنگ لڑی جا رہی ہے اس میں کتنی مدد ملی یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ اصول تنقید کے معاملے میں احتشام حسین کا رویہ کتنا ہی سخت اور بے لچک سہی لیکن عملی تنقید میں یعنی جب وہ کسی فن کار یا فن پارے پر تنقید کرتے ہیں تو یہ شدت کسی حد تک کم ہو جاتی ہے اور افادیت کے علاوہ وہ ادب کے دوسرے پہلوؤں کو بھی نظر میں رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی ہمارے عہد کے سب سے اہم ترقی پسند نقاد گزرے ہیں۔ان کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے نظری اور عملی دونوں حوالوں سے متواتر اور مسلسل لکھا ہے جس کی تائید ان کی شائع ہونے والی کتابوں سے ہوتی ہے۔ توازن، کروچے کی سرگزشت، نشانات، مضامین، اشاریے، جہات، ادراک، جوش ملیح آبادی: ایک مطالعہ، غالب اور آج کا شعور جیسی وقیع تنقیدی کتب اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ انھوں نے نظریاتی تنقید کو سنجیدگی کے ساتھ اختیار کیا۔

مارکسی ناقد کو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ ادیب کیا کہتا ہے اسے اس سے اتنی دلچسپی نہیں کہ وہ کیسے کہتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انتہا پسند ناقدین نے ادب کو محض اشتراکیت کے پرچار کا ذریعہ تصور کرتے ہوئے تخلیق کو صرف نعرہ بازی بنا دیا اور پراپیگنڈہ پر ادبی حسن کو بھینٹ چڑھا دیا۔ادب کے مقصد سے شاید کسی کو بھی انکار نہ ہوگا لیکن جب ایک مخصوص نوع کا مقصد ہی ادب سمجھا جائے تو تنقید تخلیق کی راہنمائی کی بجائے راستہ کا پتھر بن جاتی ہے، چنانچہ اردو کے بعض مارکسی ناقدین

نے ماضی کے بعض عظیم شعراء کو محض اس بنا پر درخور اعتنا نہ سمجھا کہ انہوں نے اس جاگیردارانہ نظام کو مخالفت نہ کی جس میں وہ سانس لینے پر مجبور تھے۔

عہدِ حاضر میں ترقی پسند تنقید کا ایک اہم ترین نام ڈاکٹر علی احمد فاطمی کا بھی ہے۔ وہ شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ ان کا شمار عصر حاضر کے مایہ ناز اور معتبر نقادوں میں ہوتا ہے۔ وہ سکہ بند ترقی پسند ناقد ہیں اور آج اس تحریک کی ذمہ داری انھوں نے ہی سنبھال رکھی ہے۔ ان کے لب و لہجے میں نرمی، وضع داری اور خوش گفتاری ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ وہ منطقی استدلال سے کام لیتے ہیں اور بہت سلجھے ہوئے انداز میں اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔

علی احمد فاطمی نے ادب کے مختلف اصناف پر کتابیں لکھنے کے علاوہ سیاست اور تاریخ پر بھی گراں قدر کتابیں تصنیف کی ہیں۔ پروفیسر علی احمد فاطمی کی اب تک ایک درجن سے بھی زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں:

۱۔	احتشام حسین: ذکر و فکر	۲۔	ترقی پسند تحریک: سفر در سفر
۳۔	تین ترقی پسند شاعر: سردار، مجروح، کیفی	۴۔	سجاد ظہیر: ایک تاریخ، ایک تحریک
۵۔	فیض: ایک نیا مطالعہ	۶۔	جوش ملیح آبادی - نئے تناظر میں
۷۔	نظیر اکبر آبادی	۸:	اقبال اور الہ آباد
۹۔	تخلیق کار: قمر رئیس	۱۰۔	شاعر دانشور: فراق گورکھپوری
۱۱۔	پریم چند نئے تناظر میں	۱۲۔	کلیات علی سردار جعفری جلد دوم
۱۳۔	کلیات علی سردار جعفری جلد اوّل	۱۴۔	باقیاتِ علی سردار جعفری
۱۵۔	سات سمندر پار	۱۶۔	نئی تنقید نئے اقدار
۱۷۔	عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار	۱۸۔	تاریخی ناول: فن اور اصول
۱۹۔	سفر ہے شرط	۲۰۔	جرمنی میں دس روز
۲۱۔	جڑیں اور کونپلیں		

ہندوستان میں اردو کے ایسے ادیبوں کی تعداد بہت کم ہے، جو مختلف موضوعات پر یکساں دسترس رکھتے ہوں۔ اس حوالے سے علی احمد فاطمی کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ انھوں نے مختلف النوع موضوعات پر جم کر لکھا ہے۔ مختلف شخصیات پر لکھی گئی کتب میں انھوں نے روایتی انداز سے ہٹ کر لکھا ہے اور سوانحی حالات بھی یکسر مختلف انداز سے دیکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

احتشام حسین : ذکر و فکر علی احمد فاطمی کی اہم ترین کتاب ہے جس میں انھوں نے مختلف موضوعات پر پوری ذمہ داری سے لکھا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے احتشام حسین کے فکری ارتقا کو تلاش کیا ہے۔ وہ کونسے اسباب و عوامل تھے کہ احتشام حسین نے اپنے لیے ترقی پسند فکر کو منتخب کیا۔ اس کتاب میں فاطمی نے احتشام حسین کے اہم ترین موضوعات پر کھل کر لکھا ہے۔ مثال کے طور پر غالب کے حوالے سے احتشام حسین کی فکری یگانگت کو تلاش کیا ہے۔ انھوں نے تہذیب اور ادب کے تال میل کے رشتوں کو جوڑا ہے۔ اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تہذیب اور ادب ہم آمیز

ہو جائیں تو ایک لافانی تخلیق جنم لیتی ہے۔

احتشام حسین کے نزدیک ہر وہ نقاد قابلِ رحم ہے کہ جو ہر ادبی کارنامہ پر زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے۔ ایک عام سی تخلیق کو ایک اعلیٰ پائے کی تخلیق قرار دیتا ہے۔ اُس کے نزدیک ہر ادیب اور شاعر باکمال ہے اور وہ کسی نقطہ نظر سے تعارض نہیں کرتا۔ اس صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اس ادیب کی کیفیت اُس دکاندار جیسی ہے جو اپنے ہر مال کی تعریف کرتا ہے۔ اس حوالے سے علی احمد فاطمی نے اس کتاب کے آغاز میں احتشام حسین کی ایک تحریر کا درج ذیل اقتباس بھی دیا ہے:

> ''ادب مقصد نہیں ذریعہ ہے۔ ساکن نہیں متحرک ہے۔ جامد نہیں تغیر پذیر ہے۔ اسے تنقید کے چند اصولوں اور نظریوں کی مدد سے نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ ایک فلسفیانہ تجربہ ہی کام آسکتا ہے، جس کی بنیاد تاریخ کے مادی ترجمان اور ارتقا بالضد کے اصولوں پر رکھی گئی ہو۔'' (۳)

ترقی پسند تحریک اور احتشام حسین ایک لازم و ملزوم کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب اور جہاں بھی ترقی پسند تنقید کا تذکرہ آتا ہے تو احتشام حسین کا تذکرہ ضرور ہوتا ہے۔ اس حوالے سے علی احمد فاطمی نے اس کتاب میں بالخصوص اس موضوع بھی لکھا ہے اور ترقی پسند تنقید کے تناظر میں احتشام حسین کی فکر کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔

اگرچہ احتشام حسین کو ہمیشہ سے مارکسی نقاد سمجھا جاتا رہا ہے مگر وہ مارکس کے تصورات تک براہ راست نہیں بلکہ مختلف فکر و مراحل طے کر کے پہنچے جیسا کہ قاسم صدیقی کے نام مکتوب میں انھوں نے خود بھی اس کی وضاحت کی ہے۔

> ''مغربی نقادوں میں میں نے کسی کو اپنا ماڈل بنانے کی کوشش نہیں کی۔ متاثر کئی ایک سے ہوا ہوں بلکہ یوں کہو کہ بعض اوقات متضاد قسم کے لوگوں سے، مجھے بہت سی باتیں میتھو آرنلڈ کی پسند آئیں، بعض ایلیٹ اور رچرڈسن کی اور بعض ہربرٹ ریڈ کی پھر مارکسزم سے متاثر ہونے کی وجہ سے مارکسی نقادوں سے زیادہ فائدہ اٹھاتا رہا۔ کسی کی پیروی نہیں کی۔'' (۴)

لیکن اس کے باوجود احتشام حسین ایک مخصوص نظریے کے حامل تحریک سے وابستہ تھے، اسی لیے وہ بھی اس کے حسن و قبح میں برابر کے شریک تھے۔ وہ اس لحاظ سے نظریاتی نقاد تھے کہ مارکسی تصورِ ادب و نقد کے حامی تھے لہٰذا اسی تصور سے وابستہ نزاعی مباحث سے محفوظ نہ تھے ان پر اعتراضات بھی ہوئے اور خود انھوں نے بھی دوسروں پر گرفت کی مگر کبھی بھی شائستگی اور تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ قلم کو کبھی دشنام کی سطح تک نہ لائے اور ہر حال میں لفظ کی حرمت کو ملحوظ رکھا۔ علاوہ ازیں علی احمد فاطمی نے احتشام حسین کے کچھ دیگر موضوعات پر بھی لکھا ہے۔ مثال کے طور پر: احتشام حسین کی تنقید نگاری: فکشن کے حوالے سے'، 'ترقی پسند تنقید: چند اشارے'، 'سفر نامہ کا فن اور ساحل سمندر'، 'احتشام حسین کے افسانے'، 'تہذیب سے تعلیم تک (یادیں)'۔ ان موضوعات پر علی احمد فاطمی نے احتشام حسین کی فکر اور اسلوب کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔

علی احمد فاطمی نے احتشام حسین کی تنقیدی فکر کو ایک بڑی خوبی ان کا سلجھا ہوا واضح سنجیدہ اور مدلل انداز میں بیان کیا ہے۔ اس زمانے میں جب نثر کی رنگینی و رعنائی کو ہی سب کچھ سمجھا جاتا تھا جب چلتے ہوئے جملوں کو لوگ تنقید کہتے

تھے۔انھوں نے خالص علمی نثر کو اپنی تنقید کے لیے اپنایا اور صاف ستھری غیر مبہم زبان میں اپنی بات کہی۔ یہی وجہ ہے کہ احتشام حسین کا خیال ان کی نثر کے آئینے میں پوری طرح روشن ہو جاتا ہے جن لوگوں نے خوبصورت لفظوں اور چست فقروں کا سہارا لیا اور خیال کی تہی دامانی کو نثر کی رنگینی اور عنائی میں چھپا دینا چاہا وہ کامیاب نہ ہو سکے۔اس کے برعکس احتشام حسین دھیرے دھیرے اہل علم کے دلوں میں گھر کرنے اور انھیں اپنا ہم خیال بنا لینے میں کامیاب ہو گئے۔

علی احمد فاطمی کی یوں تو تمام کتابیں ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی حاصل کر چکی ہیں تاہم ان میں ایک اور کتاب اقبال اور الہ آباد کو موضوع منفرد ہونے کی بنا پر کافی سراہا گیا ہے۔علی احمد فاطمی نے اپنی اس کتاب میں اقبال کے سیاسی نظریے پر تفصیلی اور معروضی بحث کی ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنی اس کتاب میں تاریخی دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال کا مشہور 'خطبہ الہ آباد' میں دو قومی نظریہ جیسی کوئی بات نہیں ہے۔انہوں نے اس تاثر کو بھی غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال بانیان پاکستان میں سے تھے۔

علی احمد فاطمی نے ترقی پسند شاعر علی سردار جعفری کے کلام کو دو جلدوں میں یکجا کر کے اپنی فکری وابستگی کا بین ثبوت دیا۔اس کے علاوہ انھوں نے علی سردار جعفری کا وہ کلام جو کلیات میں شامل نہ ہو سکا تھا اور بعد میں دستیاب ہوا تھا اُسے باقیاتِ علی سردار جعفری میں شامل کر کے ایک الگ کتاب کی صورت میں یکجا کر دیا۔

ترقی پسند شاعروں میں فیض احمد فیض کا نام ایک معتبر حوالہ ہے۔اُن کی فکر سے مختلف مکتبہ فکر سے وابستہ افراد سے اختلاف کے باوجود اُن کی شاعری سے حظ یاب ہوئے:

علی احمد فاطمی نے فیض کے حوالے سے اپنی کتاب فیض: ایک نیا مطالعہ میں لکھتے ہیں:

> ''فیض کی نرم و نازک شاعری، نظم کا غزلیہ انداز، پرانی بوتل میں نئی شراب تمام قارئین و ناقدین کو اس قدر پسند آئی کہ وہ آنکھ بند کر کے ہر طبقۂ فکر کے محبوب و مقبول شاعر تسلیم کیے گئے اور ترقی پسند تحریک کی سب سے اہم اور بلند و بالا شخصیت۔ان کی شاعری کی محبوبیت اور مقبولیت سے کسے انکار۔لیکن اس کے اسباب و علل یا اس کے عوامل و محرکات پر غور کرنے کی عام طور پر زحمت نہیں کی گئی۔شاید اس کی ضرورت نہ تھی۔سب کو آم کھانے سے مطلب پیڑ کو شمار کون کرے۔سب کے سب فیض کی دلنواز شخصیت اور شاعرانہ غنائیت میں اس قدر گم تھے کہ کسی نے یہ جاننے کی ضرورت نہ سمجھی کہ ان سب کے پیچھے محض روایتی عشق و محبت یا حرف و لفظ کی دروبست کا معاملہ نہ تھا بلکہ ابتدائی تعلیم و تہذیب اور فکر و دانش کے وہ سلسلے تھے جس نے فیض کو محض روایتی شاعر نہیں بننے دیا بلکہ مفکر و دانشور بھی بنایا۔''(۵)

اس میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ فیض نے مشق سخن کے آداب اور اس کی روایت کی پاسداری کا فریضہ ایسے انجام دیا کہ پیشتر ترقی پسند شعرا ان کے ہم سفر نظر آتے ہیں۔گو اپنے خیالات کی ترجمانی کے لیے انھوں نے غزل اور نظم کا انتخاب کیا اور یہ ثابت بھی کیا کہ ان دونوں کے دامن میں اتنی وسعت ہے کہ وہ اپنے عہد کے تقاضوں کے پیش نظر اپنے آپ کو ڈھال لیتی ہیں۔فیض کی شاعری احساس اور تاثرات کی شاعری ہے۔جسے محسوس کیا جا سکتا ہے' بیان نہیں کیا

جا سکتا۔ ان کی غزلیں اور نظمیں دونوں دل و دماغ کو متاثر کرتی ہیں۔ ان کے اشعار اُن کے مستحکم ارادوں کے جرأت مندانہ اقدام اور جوش و بغاوت کا پتا دیتے ہیں۔ اُن کی شاعری کا بڑا حصہ علامتوں پر قائم ہے۔ انھوں نے نظم کی کلاسیکی روایت کو انقلابی اور نئے سانچے میں ڈھالا ہے۔ کلاسیکل الفاظ کو نئے تیور دیئے ہیں۔

ترقی پسند شاعروں میں فراق گورکھپوری کا نام ایک اہم حوالہ ہے۔ علی احمد فاطمی نے جہاں فیض احمد فیض کے حوالے سے اپنے مخصوص تنقیدی اسلوب میں لکھا ہے وہاں فراق کے شعری آفاق کو دریافت کرنے کے لیے بھی ایک کتاب شاعر و دانشور: فراق گورکھپوری کے عنوان سے لکھی ہے۔

فراق کا شمار ہمارے اُن شاعروں میں ہوتا ہے جنھوں نے غزل کی روایت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے لیے الگ راہ نکالی۔ فراق گورکھپوری نے تمام تر لسانی اور مذہبی تعصبات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اردو غزل کو کئی نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ فراق کی شاعری پر اس دور کے شعراء کی چھاپ بھی نظر آتی ہے۔ انھوں نے شروع میں کلاسیکی انداز کو اپنایا اور اپنے موضوعات میں تنوع پیدا کرنے کے لیے حسرت موہانی کی طرح ہر ایک استاد سے فیض یاب ہونے کی کوشش کی تاکہ اسلوب میں نکھار اور انفرادیت نظر آئے۔ فراق نے اردو شاعری کو ایک نیا آہنگ، نیا لہجہ اور دلکش پیرایۂ بیان دیا۔ اُن کا خاص اسلوب قاری کو بتا دیتا ہے کہ یہ آواز فراق ہی کی ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں فراق اور وصال کے لمحوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ رنج و راحت میں بھی ہم آہنگی پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

اس حوالے سے ڈاکٹر کامل قریشی کا کہنا ہے:

> ''فراق کی غزلوں کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو ان کی روحِ شاعری اور محاسنِ کلام کا اندازہ کر لینا مشکل نہیں۔ ان کا مخصوص آہنگ، خاص لب و لہجہ اور منفرد اندازِ بیان صاف بتا دیتا ہے کہ یہ فراق کی آواز ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے غم و نشاط، خوشی و الم، رنج و راحت اور زخم و مرہم میں ایک طرح کی ہم آہنگی اور ربط و ضبط پیدا کر کے زندگی کی تلخیوں کے ساتھ پیمانِ وفا باندھنے کی سعی کی ہے۔'' (٦)

علی احمد فاطمی نے فراق کی شاعری میں حسن و عشق کے جدید تصور کو تلاش کیا ہے۔ اس کی وجہ تو یہ ہے کہ فراق کی شاعری میں جو نفسیاتی گہرائی، پیچیدگی اور وسعت پائی جاتی ہے وہ دیگر شعرا میں اس انداز میں نظر نہیں آتی۔ فراق کے ہاں کلاسیکی شاعری کی طرح رقیب کے حائل ہونے کا رونا نہیں ملتا، نہ ان کی شاعری میں ماتمِ بے وفائی اور محبوب کی کج ادائی کا تذکرہ ہے۔ یہاں حسن و عشق وفا اور جفا کی پرانی تقسیم سے آزاد ہیں۔ یہاں دونوں کے درمیان اگر کوئی چیز حائل ہے تو وہ بذاتِ خود عاشق اور محبوب ہیں۔ ان دونوں کے درمیان معاشرتی دیواریں حائل نہیں ہیں۔ اس نئی زندگی میں دونوں کے کچھ سپنے، کچھ خواہشیں، کچھ تمنائیں؛ اور ان تمناؤں میں چھپی ہوئی مسرتیں ہیں۔ یہ لمحات اُسے کسی طور بھی بے چین اور بے قرار نہیں ہونے دیتیں۔ وہ اگر غمگین بھی ہوتے ہیں تو غم سے نڈھال نہیں ہوتے۔ کیوں کہ غم ایک ایسا عنصر ہے جس سے حقیقی شاعر کو گزرنا پڑتا ہے۔

ترقی پسند تنقید کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نظریاتی تحریک نے نظیر اکبر آبادی کو وہ شہرت دلائی جو پہلے انھیں میسر

نہیں تھی۔اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ نظیر چونکہ عوام سے تھے،اس لیے انھیں عوام کے مصائب وآلام سے بخوبی آ گاہی تھی۔ اسی پس منظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترقی پسند فکر نے اس طرف توجہ دی۔نظیر عوام کی سنگلاخ زندگی کی بھیانک حقیقتوں سے واقف تھے۔نظیر ایک وسیع المشرب انسان تھے اور ہر مذہب وملت کے لوگوں کے لیے ان کے دل میں بے پناہ پیار تھا۔ اُن کا تعلق متوسط طبقے سے تھا، اس لیے وہ عوام کے مسائل اور مشکلات کو بخوبی سمجھتے تھے۔خارجی حالات نے اُن کی زندگی پر بہت اثر ڈالا اور اُن کی شاعری میں یہ کیفیت اجاگر ہوئی کہ وہ عوام کے دکھ درد کو سمجھنے لگے۔ڈاکٹر سلیم اختر نے بڑی خیال انگیز بات کی ہے:

> ’’نظیر کی افسردگی خارجی حالات کے برعکس ایسی نفسی کیفیت معلوم ہوتی ہے جسے کیموفلاج کرنے کے لیے اس نے گلی کوچوں کی دنیا اور میلے ٹھیلوں کی بھیڑ میں خود کو گم کرنا چاہا ہو مگر جو مسلسل تخلیقی محرک کے طور پر برقرار بھی رہی۔جبھی تو اس کے اشعار کی ندی ’’آہ‘‘ اور ’واہ‘ کے کناروں کے درمیان رواں دواں نظر آتی ہے۔نظیر ایسی شخصیت ہے جسے کلام کی انفرادیت کی بنا پر کسی بھی شعری دبستان سے وابستہ قرار دینا بہت مشکل ہے۔دہلی اور لکھنؤ ایسے ثقافتی اور ادبی مراکز سے دور اکبر آباد کا نظیر اپنے رنگ کا موجد اور خاتم ہے۔وہ اپنی ذات میں ایک تحریک ہے جو کلیات کے اعتبار سے ایک دبستان اور اس لحاظ سے وہ بے نظیر ہے۔‘‘(۷)

اس سلسلے میں دیگر ناقدین کی طرح علی احمد فاطمی نے بھی نظیر اکبر آبادی کے حوالے سے کھل کر لکھا۔ **نظیر اکبر آبادی** کے عنوان سے اپنی اس کتاب میں انھوں نے نظیر کی شاعری کو ترقی پسند فکر کے تناظر میں دیکھا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے اس کتاب میں نظیر کے سیاسی وسماجی پس منظر میں ان کی سوانح کو ترتیب دیا ہے اور سوانح نظیر کے چند حقائق بھی دریافت کیے ہیں۔وہ اس حوالے سے بخوبی جانتے ہیں کہ چونکہ نظیر اکبر آبادی کا شمار اردو نظم کے اُن بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی مشقِ سخن سے ایک جہانِ معنی کو کمال مہارت سے آباد کیا، اس لیے نظیر نے جس طرح عوامی رویے، مزاج، رسوم، تہوار اور موسم وغیرہ کو جس طرح انھوں نے سمجھا اردو نظم اس کی مثال دینے سے قاصر ہے۔وہ بلاشبہ اردو شاعری کے بہت بڑے محسن ہیں کیوں کہ انھوں نے ایسے وقت میں نظم نگاری شروع کی جب ہر طرف غزل کا سماں بندھ چکا تھا۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں میں پریم چند کو اوّلیت اس لیے بھی حاصل ہے کہ انھوں نے ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین کے لکھنؤ میں منعقد ہونے والے پہلے اجلاس کی صدارت بھی کی۔پریم چند کے حوالے سے علی احمد فاطمی نے بھی ایک کتاب **پریم چند :نئے تناظر میں** کے عنوان سے لکھی۔یہ کتاب تخلیق کار پبلی کیشنز دہلی کے اہتمام سے شائع ہوئی۔اس کتاب میں انھوں نے ’پریم چند: روایت ساز یا روایت شکن‘، ’پریم چند کی حقیقت بیانی اور نئی اردو کہانی‘، ’پریم چند اور فرقہ واریت‘، ’پریم چند اور ترقی پسند تحریک‘، ’پریم چند کے نسوانی کرداروں کی ایک جھلک‘، ’پریم چند اور الٰہ آباد‘ جیسے اہم موضوعات پر لکھا۔علی احمد فاطمی کے نزدیک پریم چند کے ہاں جذبات نگاری بھی، تنقیدِ حیات ہے اور ترغیب واصلاح بھی۔ اور یہی وہ معاشرتی اور سیاسی شعور تھا جس نے پریم چند کو حقیقت پسند افسانہ نگار بنایا اور پھر ان کے افسانے اخلاقی، معاشرتی

اور سیاسی تقاضوں کی ترجمانی کرنے لگے۔ ان کے افسانوں میں ملک و قوم کے لیے ایثار و محبت کے جذبے بیدار ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پریم چند نے ایک ماہر نفسیات کی طرح محکوم قومیتوں کو عزم و ہمت کے گر سکھائے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ انسان دوستی اور وطن دوستی کی بہترین مثالیں پیش کی ہیں۔ یوں پریم چند کے ہاں سچی وطن دوستی، سماجی اصلاح کا جذبہ، دیہاتی زندگی کے مرقعے، طبقاتی کشمکش اور کردار نگاری کے خوبصورت نمونے ملتے ہیں۔ انھوں نے تخلیقی جبلت کو محض افسانہ نگاری کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ اس میں مقصدیت کی روح کو سمو کر ایک مصلح قوم کا کردار بھی ادا کیا ہے۔

علی احمد فاطمی نے تاریخی ناول نگاری کے حوالے سے ایک اہم ترین نام عبدالحلیم شرر کے حوالے سے بھی تحقیقی و تنقیدی کام کیا ہے۔ اُن کی کتاب عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ جس میں انھوں نے تاریخی ناول کے فن اور ارتقا کے تناظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے شرر کی تاریخی ناول نگاری کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ عبدالحلیم شرر بھی سرسید دور کی اہم شخصیت تھے۔ یہ عجیب دور تھا اس دور میں نثری ادب میں زبردست ترقی ہوئی۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ نہ اتنی ترقی ماضی میں ہوئی تھی اور نہ مستقبل میں ہو سکتی ہے۔ شرر صاحب نے بھی مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی۔ آپ نے ایک ایک صنف پر اتنا مواد چھوڑا ہے کہ ایک ایک صنف پر مکالہ لکھا جا سکتا ہے۔ تاریخی ناول نگاری کی طرف ان کی توجہ مغرب کی اسلامی تاریخ پر حملوں کے بعد ہوئی۔ شرر نے جب والٹر اسکاٹ کا ناول دیکھا اور پڑھا۔ جس میں حضور کی شان میں نازیبا کلمات کہے گئے تھے تو جواب میں شرر بھی ناول نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔ اُن کے پہلے ناول کا نام دلچسپ تھا۔ اس کے بعد ''دلکش''، فلورا فلونڈا، بدرالنساء کی وصیت، شوقین ملکہ اور مینا بازار جیسے ناول منظر عام پر آئے۔ انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے مغرب کے اسلام کے خلاف منفی پروپیگنڈے کا جواب دیا۔

علی احمد فاطمی اس وقت ترقی پسند تنقید نگاری میں پیش پیش ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی تنقیدیں ایک خاص نقطہ نظر کی حامل ہوتی ہیں اور یہ نقطہ نظر تنقید کا اشتراکی اور مارکسی نقطہ نظر ہے جس میں ادب کی تاریخی اور عمرانی حیثیت کو خاص اہمیت حاصل ہے جس کے نزدیک ادب کو تمام علوم کی روشنی میں دیکھنا ضروری ہے جس کے پیش نظر ایک ایسے تجزیے کی ضرورت ہے جس کی بنیاد تاریخ کی مادی ترجمانی کے اصول پر ہو۔ بغیر اس کے ادب کا صحیح شعور ناممکن ہے احتشام صاحب ادب و شعر کو اسی طرح دیکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید میں مارکسی اور اشتراکی تنقید کے اثرات کا پتہ چلتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ظہیر کاشمیری، ادب کے مادی نظریے، (لاہور: کلاسیک، س۔ن)، ص۶۷

۲۔ شارب ردولوی، جدید اردو تنقید—اصول و نظریات، (لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۷ء)، ص۳۴۵

۳۔ علی احمد فاطمی، احتشام حسین: ذکر و فکر، (الہ آباد: رجحان پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص۵

۴۔ فروغ اردو، احتشام حسین نمبر، لکھنؤ، ۱۹۷۴ء

۵۔ علی احمد فاطمی، فیض: ایک نیا مطالعہ، (الہ آباد: ادارۂ نیا سفر، ۲۰۱۲ء)، ص۹

۶۔ کامل قریشی، اردو غزل، (دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۸۷ء)، ص۲۵۳

۷۔ سلیم اختر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)، ص۱۷۹